اردو کے نمائندہ ناولوں میں فرد کے مسائل (ڈپٹی نذیر احمد سے عصمت چغتائی تک)

محمد عثمان، پی ایچ ڈی اسکالر، شعبہ اردو جامعہ پشاور
ڈاکٹر ولی محمد، لیکچرار، شعبہ اردو جامعہ پشاور

ABSTRACT

The novel is the study of human life, that deals with human beings' problems. In Urdu Literature, from Deputy Nazir Ahmad to Asmat Chughtai, many changes happen. Specifically, the conditions of 1857 are beautifully portrayed in novels. Individuals' political, economic, social, cultural and religious lives were presented in new ways. The adverse effects of Britain colonialism, capitalist rule and the social atrocities by Britain can be seen in the 19th-century novels. In the same way, in the 20th century, we can see psychological dilemmas in novels as well, specifically, Freud's Psychoanalysis helped to explain humans' psychological predicaments. This article has illustrated the personal problems of individuals in the novels from Nazir Ahmad to Asmat Chughtai.

Key words: life, novel, problems, Urdu literature, Britain colonialism, crises

کلیدی الفاظ: زندگی، ناول، عہد، فرد، مسائل، رجحانات و میلانات، سماج، معاشرہ، کردار، کشمکش

اردو ناول نگاری پر نظر ڈالی جائے تو اس میں فرد کے گوں ناگوں مسائل کا احاطہ کیا گیا ہے۔ اگرچہ اردو میں ناول نگاری کا آغاز انیسویں صدی میں ہوا مگر اس دور میں بھی ایسا ناول تخلیق کیا گیا جو بیسویں صدی کے ناول نگار کے لیے کافی حد تک نشانِ راہ ثابت ہوتا ہے۔ 1857ء کے سماجی و معاشرتی شعور کا مطالعہ اردو ناول نگاری میں اہم باب کی حیثیت رکھتا ہے۔ اس عہد میں پروان چڑھنے والی ذہنیت اپنے تہذیبی بحران اور تغیراتی اقدار کا نوحہ پیش کرتی ہے۔ یہ دور فکر وادراک کے حوالے سے فرد کی اندرونی کش مکش اور ظاہری تضادات کا عکاس ہے کیوں کہ یہاں فرد کا آسودہ ماضی تصوراتی سطح پر اس کے حال پر اتنا غالب ہے کہ وہ عملی کردار سے عاری ہو چکا ہے۔ اس لیے اگر برصغیر پاک و ہند میں دیکھا جائے تو انگریز نوآبادیاتی عہد کا دائرہ کار مغلوب قوم کو اپنے حصار میں لے کر سماجی، ثقافتی، تہذیبی، مذہبی، اقتصادی اور نفسیاتی اعتبار سے کئی محرومیوں سے ہم کنار کرتا ہے۔ ہر سطح پر غلامی کا احساس فرد کی ذاتی اور اجتماعی انا کے لیے نہ صرف تکلیف دہ تھا بلکہ اس نے روحانیت

کے فقدان کو بھی جنم دیا،ان خاص قسم کے حالات سے دیگر شعبہ ہائے زندگی کی طرح ادب بھی متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکا۔ ایسی صورت میں زندگی اپنے باطن کے خلا کو پر کرنے کے لیے کسی نہ کسی سہارے کو تلاش ضرور کرتی ہے۔یہی وجہ ہے کہ 1857ء کے جدید صنعتی اور مشینی عہد کی بازگشت جب انگریزوں کی وساطت سے برصغیر میں سنائی دی تو اس کے اثرات ادبی ایوان میں بھی بخوبی محسوس کیے گئے۔ان اثرات کے تحت اردو ادب میں جہاں دیگر شعری اور نثری اصناف کا اضافہ ہوا وہیں افسانوی سطح پر ناول جیسی حقیقت پسند صنف منظر عام پر آئی۔اردو میں ناول نگاری کا آغاز ڈپٹی نذیر احمد کے قصے کہانیوں سے ہوتا ہے ۔انھوں نے 1869ء میں اپنا پہلا ناول ''مراۃ العروس'' کے نام سے لکھا۔بعدازاں ان کا یہ ناولاتی سلسلہ ''بنات النعش'' (1872ء) ، ''توبتہ النصوح'' (1877ء)، ''فسانہ مبتلا'' (1885ء) ،''ابن الوقت'' (1888ء)''ایامی''اور''رویائے صادقہ ''(1894ء)تک قائم رہا۔یہ بات ہمارے افسانوی ادب کے بیشتر ناقدین نے پورے وثوق سے کی ہے کہ نذیر احمد اپنے ناولوں میں ہندوستانی خواتین اور مرد حضرات کی اصلاح چاہتے تھے۔وہ سماجیاتی اور معاشرتی سطح پر اپنے کرداروں کو ایک خاص لائحہ عمل اور فلسفہ حیات سے آگاہ کرنا چاہتے تھے تاکہ وقت کی نبض پر ہاتھ رکھ کر زندگی برتنے کا سلیقہ ہاتھ آسکے لیکن ان سب عوامل کے ہوتے ہوئے نذیر احمد کے ناول بدلتے ہوئے عہد کا منظر نامہ اور ہر میدان میں محسوس ہوتی ہوئی تبدیلی کے غماز ہیں۔ان کی کہانیوں میں فرد پر اچانک نئی دنیا کے دروازے کھول دیے جاتے ہیں جس کی چکاچوند اس کی آنکھوں کو خیرہ کیے بغیر نہیں رہتی۔ایک طرف ماضی کا مذہب پرست آدرش ہے جب کہ دوسری طرف جدید عہد کا تشکیک زدہ ملغوبہ جو پرانے اخلاقی نظام کے منافی تھا۔ایسے میں ڈپٹی نذیر احمد کے کردار وعظ و نصیحت ، مقصدیت ،اصلاحی نقطہ نظر،جدید نظریات اور مذہبی عقائد کے ہوتے ہوئے مختلف تضادات کا شکار نظر آتے ہیں ۔اگرچہ یہ تضادات ظاہری طور پر اس قدر واضح نہیں مگر نذیر احمد کے ناولوں کے تمام افراد باطنی و خارجی حوالے سے زبردست کش مکش آرائی سے نبرد آزما ہیں۔انیس ناگی اپنی کتاب ''نذیر احمد کی ناول نگاری''میں لکھتے ہیں:

> ''نذیر احمد کے ناول ایک مخصوص عہد کے انسانوں کے جیتے جاگتے مرقعے ہیں۔نذیر احمد کا عہد بدلتے ہوئے تمدن اور معاشرے کا عہد ہے۔1857ء کے بعد برصغیر پاک وہند کے متوسط طبقے کے مسلمانوں کے عمومی تعصبات ،خانگی زندگی کی تصویریں،حاکم و محکوم کے مسائل ،بے بس عورتوں کی مشکلات اور گم کردہ راہ نوجوانوں کی جذباتی و ذہنی کیفیات نذیر احمد کے نمائش کدے کی مختلف تصویریں ہیں۔نذیر احمد نے اس دور کی بصیرتوں ، حقیقتوں اور الجھنوں کو مختلف

طبقوں اور شخصیتوں کے حوالے سے پیش کیا ہے۔ نذیر احمد کے ناولوں میں افراد کی گہما گہمی نظر آتی ہے۔ لیکن اس تنوع کے باوجود ان افراد کی شخصیتیں، عادات و خصائل اور چہرے مہرے ایک دوسرے سے زیادہ مختلف نہیں ان کی خواہشات، ارادے، امنگیں اور اخلاقی ضوابط میں زیادہ فرق نظر نہیں آتا۔ ان کی تعمیر و تخلیق کی یکسانیت کی وجہ نذیر احمد کے معتقدات اور تعصبات کی شدت میں تلاش کیا جا سکتا ہے۔ نذیر احمد نے قصہ گوئی کے لیے جن تجربات و واقعات کو منتخب کیا ہے۔ وہ ان کے نقطہ نظر اور اسلوب زیست کے پابند ہیں"(1)

انیس ناگی کے اس تبصرے کے تناظر میں دیکھا جائے تو نذیر احمد اپنے کرداروں اور اپنی ذاتی شخصیت کے مابین کرداری معروضیت کا اکثر خیال نہیں رکھتے لیکن ان کے ناولوں کے کردار اپنے جذبات واحساسات کے لحاظ سے عمومیت کے حامل ہیں۔ خاص کر نذیر احمد کے دور میں مذہبی قدامت پسندی اور زندگی کے بدلتے ہوئے تصورات فرد کی پہلے سے طے شدہ ذہنیت پر کاری ضرب لگاتے ہیں۔ اس حوالے سے ڈپٹی نذیر احمد کا ناول "ابن الوقت" کافی اہمیت کا حامل ہے۔ جہاں ایسے کرداری مسائل جنم لیتے ہیں جس سے یہ اندازہ لگانا مشکل نہیں کہ 1857ء کے بعد جنم لینے والا معاشرہ اپنے قدیم اور مستند اقدار کی ساکھ بھی بحال رکھنا چاہتا ہے اور دوسری طرف صنعتی اور مادی عہد میں تنظیم واصلاح سے جدید تہذیب و تمدن کا خواہاں بھی ہے۔ مذکورہ ناول کے مرکزی کرداروں میں "ابن الوقت" انگریز نواز جب کہ حجتہ الاسلام اپنے مذہبی عقائد و نظریات پر سختی سے عمل پیرا ہے۔ ان دو کرداروں کے پہلو بہ پہلو انگریزوں کی نوآبادیاتی پالیسی بظاہر مثبت لیکن بباطن منفی انداز سے برصغیر کے باشندوں کے لاشعور میں سرایت کر جاتی ہے۔ لہٰذا انگریز اپنی عملداری سے ہندوستان میں جس غلام ذہن کا نقشہ ترتیب دے رہے تھے اس کی عکاسی "ابن الوقت" کے ذہنی رجحانات سے بہ خوبی ہو سکتی ہے۔ ڈپٹی نذیر احمد کے بعد "پریم چند اردو ناول میں ایک عہد کی حیثیت رکھتے ہیں۔"(2) کیوں کہ ان کے ناولوں میں بیسویں صدی کی پر آشوب زندگی اور ہندوستان کا مجموعی طرزِ احساس پایا جاتا ہے۔ موضوعاتی لحاظ سے پریم چند کے ہاں سیاسی، سماجی، معاشرتی، اقتصادی، ثقافتی، تہذیبی اور تمدنی فضا کے اثرات محسوس کیے جا سکتے ہیں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ وہ حقیقی رجحان کے بنیاد گزار تھے۔ پریم چند کے ہاں تخیل نہیں بلکہ تجربے اور مشاہدے کا وافر ذخیرہ موجود ہے۔ اسرار معابد، جلوۂ ایثار، بازارِ حسن، گوشہ عافیت، نرملا، چوگانِ ہستی، پردۂ مجاز، بیوہ، غبن، میدان عمل اور گئودان پریم چند کے ناول ہیں۔

پریم چند کے ناولوں میں بتدریج مذہبی و سماجی اصلاح ، مذہبی پیشوائیت کے نتیجے میں جنم لینے والی معاشرتی ناہمواریاں، متوسط طبقے کی زندگی اور دیہاتی ثقافت کی جھلکیاں، طوائف کا کوٹھا، ہندوستان کا سیاسی اضطراب اور ہیجان انگیزی ، معاشی مسائل کا ہندوستانی باشندوں پر اثر، کسانوں اور دیہاتیوں کی بیداری، سماجی مسائل کی عکاسی، سرمایہ دارانہ تہذیب اور اس کے منفی اثرات، فرقہ واریت، مذہبی عقائد کی شدت، قومی جدوجہد، انصاف دوستی اور حق پرستی پائی جاتی ہے۔ پریم چند کے جملہ ناولوں میں ان کا شاہ کار ناول گئودان ہے۔ یہ پریم چند کا آخری ناول ہے۔ اس کی انفرادیت یہ ہے کہ اس ناول میں ناول نگار مقصدیت کی بجائے فنی تقاضوں کا حامی ہے۔ اپنے ناول میدانِ عمل کی طرح یہ ناول بھی شہری اور دیہاتی دو حصوں میں منقسم ہے۔ گئودان کے دیہاتی حصے میں ہوری نامی ایک کسان کا المیہ بیان کیا گیا ہے جو مذہبی ٹھیکیداروں، زمین داروں کے کارندوں، سرکاری نمائندوں اور مہاجنوں کے ظلم سہہ سہہ کر پرانے فرسودہ سماج کے بندھنوں میں جکڑا ہوا ایک گائے پالنے کی چھوٹی سی حسرت کو دل میں بسائے ایک دن زندگی کی بازی ہار جاتا ہے۔ اور مرتے سمے برہمن ہوری کی بیوی دھنیا سے گئودان کے لیے کہتا ہے تو وہ ہوری کے سرد ہاتھ پر اپنی دن بھر کی کمائی بیس آنے پیسے رکھ کر برہمن سے کہتی ہے ''مہراج! گھر میں نہ گائے ہے نہ بچھیا، نہ پیسہ، یہی پیسے ہیں یہی ان کا گئودان ہے اور غش کھا کر گر پڑتی ہے۔''(3) ناول کی کہانی سے اندازہ ہوتا ہے کہ اس میں استحصال زدہ کسان اور اس کے کنبے کی فاقہ کش زندگی کن مسائل سے دوچار ہے۔ دیہی زندگی سے ہٹ کر شہری زندگی کے کردار جن میں رائے صاحب زمین دار، کھنا مل صنعت کار، مالتی لیڈی ڈاکٹر، مہتا پروفیسر اور خورشید مرزا ممبر اسمبلی جیسے کردار تعلیم یافتہ اور اونچے طبقے کے حامل ہیں۔ دیہی زندگی میں ایک معمولی کسان حسرتوں اور خواہشات کا مارا ظلم اور استحصال کی چکی پس رہا ہے جب کہ شہری زندگی اپنے بھرپور تضادات کے ساتھ اونچے طبقے کے کرداروں اور ان کے نمائش کدوں میں ہونے والی رنگ رلیوں کی عکاسی کر رہی ہے۔ پریم چند نے اس ناول میں اپنے حقیقی مؤقف کو پیش کیا ہے تاکہ سماج اور فرد کے باہمی رشتے کو اجاگر کیا جا سکے۔ اگرچہ ناول میں شہری زندگی کے تضادات کے ساتھ پریم چند شہری اور استحصال کرنے والے کرداروں پر طنز کے نشتر چلاتے ہیں مگر دیہی زندگی کی معاشرت، رہن سہن اور ثقافت کا بیان نہایت دلچسپ انداز میں کرتے ہیں۔ یوں ان کے ہاں فرد کی حقیقی زندگی تک رسائی ممکن ہوتی ہے۔ بقول پروفیسر یوسف سرمست:

> ''انھوں نے اس ناول میں پورے گاؤں کی زندگی کو، اس کے پورے افراد کو اور اس کے سارے مناظر کو اور اس کی زندگی کے ہر رخ کو اپنی تمام تر جزئیات کے ساتھ پیش کیا ہے۔ رائے اگرپال

سنگھ سے لیکر سلیا چمارن تک گاؤں کی زندگی کا کوئی پہلو اور گوشہ ایسا نہیں ہے جس کی عکاسی پریم چند نے گئودان میں نہ کی ہو۔ پھر ہر واقعہ سچا اور حقیقی معلوم ہوتا ہے، خواہ وہ روپا اور سونا کی شادی ہو یا ہوری کی موت۔ گئودان میں گاؤں کی زندگی کے بے شمار مسئلے اور ان گنت پہلو دکھائے گئے ہیں۔ لیکن ہر جگہ زندگی سانس لیتی نظر آتی ہے۔ یہی اس ناول کی امتیازی خصوصیت ہے ''[4]

پریم چند کے بعد مولانا عبدالحلیم شرر کا نام ناول نگاری کے حوالے سے کافی اہمیت کا حامل ہے۔ شرر نے سر والٹر اسکاٹ کے ناول ''طلسمان'' کا مطالعہ کر کے یہ بات اخذ کی کہ اسکاٹ نے مسلمانوں سے ناانصافی برتی ہے۔ اس غلط فہمی میں مبتلا ہو کر مولانا نے سوچا کہ وہ تاریخی سطح پر مسلمانوں اور اپنے اسلاف کے کلیدی کردار کو اجاگر کر کے اپنے عہد کے مسلمانوں میں جوش اور ولولہ پیدا کریں گے [5] تاریخ جیسے خشک بیانیے کے ساتھ ساتھ مولانا نے اپنی تحریروں میں رومان پرور داستانوں اور طلسماتی فضا سے دریغ نہیں کیا۔ لہٰذا ان کے ناولوں میں خلافِ توقع مبالغہ آرائی اور غیر حقیقی واقعات کی بھر مار ہے۔ ان کے ناولوں کو تاریخی اور معاشرتی سطح پر تقسیم کیا جاسکتا ہے۔ گو مولانا کا ناولاتی ذخیرہ اپنی بسیار نویسی کی بھینٹ چڑھ گیا مگر ان کا دور ناول کی تخلیق کے لحاظ سے ابتدائی مرحلے میں تھا۔ پروفیسر علی احمد فاطمی کے الفاظ میں کہ ''شرر نے جس دور میں ناول لکھنا شروع کیا وہ دور نہ صرف تاریخی ناول کا بلکہ خود صرف ناول کا ابتدائی دور تھا۔''[6] فردوسِ بریں ان کے دیگر ناولوں کی نسبت حقیقت کے زیادہ قریب معلوم ہوتا ہے۔ اس ناول میں فرد کے داخلی پہلوؤں کی عکاسی اضطراری حالات کے تناظر میں کی گئی ہے۔ انجانا خوف، تذبذب اور شخصیت کی بے قرار جہتیں اس ناول کے مرکزی کردار حسین میں کافی حد تک پائی جاتی ہیں۔ فرقہ باطنیہ سے جنم لینے والے عقائد اور اسلام دشمن عناصر جس طرح لوگوں کو اپنی طرف راغب کرتے ہیں اسے مولانا نے کرداری سطح پر پیش کیا ہے۔ اس تناظر میں پروفیسر یوسف سرمست لکھتے ہیں:

''فرقہ باطنیہ میں حسین کی شمولیت اس فرقہ کی غیر معمولی قوت، اپنے معتقدین کو قابو میں رکھنے کے حیرت ناک ذرائع، اس فرقہ کی بعض غیر معمولی شخصیتیں، اس فرقہ سے ہونے والی تباہیاں، اس فرقہ کے ہاتھوں میں پڑ کر حسین کے بہیمانہ جرائم کا ارتکاب، ان کی تعمیر کردہ مصنوعی جنت اور آخر میں اس فرقہ کی تباہی اور تمام پر اسرار حالات کا انکشاف سامنے آتا ہے ''[7]

فردوسِ بریں چوں کہ تاریخ کے ایک خاص عہد اور اس میں پیدا ہونے والے مخصوص فتنے سے تعلق رکھتا ہے اس لیے یہ ناول فرد کے سماجی و عائلی مسائل کا مکمل احاطہ نہیں کرتا۔ مجموعی اعتبار سے اس ناول میں فرد کی نفسیات پر پڑنے

والے اثرات کو ہمہ گیر ہوتے نہیں دکھایا گیا، کیوں کہ ناول میں ''فرقہ باطنیہ کی ساری کاروائیاں تو سامنے آجاتی ہیں لیکن ان کی وجہ سے اس عہد کی زندگی جن مسائل سے دوچار ہو رہی تھی اس پر کوئی روشنی نہیں پڑتی۔ ''(8)

افشائے راز، اختری بیگم، ذاتِ شریف، شریف زادہ اور امراؤ جان ادا مرزا محمد ہادی رسواؔ کے تخلیق کردہ ناول ہیں۔ ان میں امراؤ جان ادا نہ صرف رسواؔ بلکہ اردو ادب کی انفرادی پہچان ہے ''یہ ناول اپنے موضوع، کردار نگاری اور اسلوب بیان کے حوالے سے ناول کے ارتقا میں ایک اہم پیش رفت کے طور پر جانا جاتا ہے''(9)

دراصل امراؤ جان ادا طوائف کی کہانی ہے جو حالات کی ستم ظریفی کی وجہ سے امیرن سے امراؤ جان بن کر خانم کے کوٹھے کی زینت بنتی ہے اور آخر میں توبہ تائب ہو جاتی ہے۔ بظاہر اس عمومی پلاٹ میں رسواؔ نے کمال کردار نگاری کے ساتھ سماجی و تہذیبی اقدار کی شکست وریخت کا احاطہ فرد اور معاشرے کے تناظر میں کیا ہے۔ لکھنؤ کی عروج پاتی تہذیب اور اس کے زوال آمادہ رویے اس عہد کے افراد کو ہر سطح پر متاثر کرتے ہیں۔ اس ناول میں پیش کردہ اخلاقی گراوٹ، نمائش بنی، تعیش پسندی، سہل مزاجی اور رؤسا کی پست ذوقی سے قاری اس مخصوص کلچر سے ربط و تسلسل قائم کر لیتا ہے۔ یوں لکھنوی دور میں جنم لینے والے مسائل کو سمجھنا قدرے آسان ہو جاتا ہے۔ رسواؔ نے فرد کی داخلی کیفیات اور اس کی متزلزل شخصیت کو ہر طبقے کی مناسبت سے اجاگر کیا ہے۔ اس طرح خارجی سطح پر رونما ہونے والے واقعات سماج کی بھرپور نمائندگی کرتے نظر آتے ہیں۔ ''بیسویں صدی میں اردو ناول'' کے مصنف نے اس ناول کا رشتہ زندگی کے حقائق سے جوڑ کر فرد پر اس مجموعی ماحول کے اثرات کو ان الفاظ میں سراہا ہے:

> ''رسوا نے سماج کے حقائق کو بھی ملحوظ رکھ کر اپنے ناول کو زندگی سے بہت قریب کر دیا ہے۔ انھوں نے داخلیت اور خارجیت کے توازن کو برقرار رکھتے ہوئے فرد اور سماج کے رشتے کو اس عمدگی سے پیش کیا کہ اس کی مثال امراؤ جان ادا سے پہلے کہیں نہیں ملتی اور اس لحاظ سے یہ ''شاہدِ رعنا'' پر سبقت لے جاتا ہے۔ فرد پر اس کے مخصوص ماحول کا جو اثر پڑتا ہے اور پھر فرد اپنی خواہشات کی بناء پر اس ماحول کو بدلنے کی جو کوشش کرتا ہے اس چیز کو پیش کرنے میں رسوا نے جس سلیقہ کا ثبوت دیا ہے اس کی وجہ سے امراؤ جان ادا میں فلابیر کے ناول مادام بواری کی سی شان پیدا ہو گئی ہے۔ ''(10)

اردو ناول نگاری کی روایت میں 1932ء کا دور کافی اہم ہے۔اس عرصہ میں عزیزاحمد نے ناول کے میدان میں قدم رکھااور اردوادب کو ہوس 1932ء، مرمر اور خون 1932ء، گریز 1943ء، آگ 1946ء،ایسی بلندی ایسی پستی 1947ءاور شبنم 1949ء، تخلیق کر کے دیے۔عزیزاحمد اردو ناول نگاروں کی اس نسل سے تعلق رکھتے ہیں جنہوں نے صنعتی، مشینی اور جدید رجحانات کے تغیرات کو نہ صرف تیزی سے قبول کیا بلکہ اس کے زیر اثر روحانی اقدار کی پامالی، مشرقی سوسائٹی سے بیزاری، جنسی گھٹن کے نتیجے میں پیدا ہونے والا انتشار اور جدید تہذیب کے منفی رجحانات ومیلانات کو فرد کی باطنی سطح پر کافی محسوس کیا۔اس حوالے سے عزیزاحمد کے ناول گریز کی اہمیت سے انکار ممکن نہیں۔ گریز میں جس فرد کو پیش کیا گیا ہے اس کا المیاتی تصور روح عصر میں تو پروان چڑھ رہا ہے مگر ذہنی سطح پر وہ نئ تہذیب سے جنم لینے والے مسائل اور زندگی کی کرب ناک صورت حال سے کافی حد تک گریزاں ہے۔اس ناول پر عریانیت کا لیبل بھی لگایا گیا لیکن زندگی کی نت نئ تبدیلیاں اور فرد کی جسمانی ضروریات کو ہیجان انگیزی میں مبتلا کرنے کے لیے عزیزاحمد کے عہد سے نظریں چرانا ممکن نہیں۔اس دور میں ماضی کے اخلاقی معیارات کو تشکیک زدہ ذہن نے کافی حد تک متاثر کیا۔لہذا فرد نے نئ دنیامیں قدم رکھنے کے ساتھ ساتھ سماج کی بے جا قدغنوں اور جنسی پیچیدگی سے چھٹکارا حاصل کرنے کی کوشش کی۔فرد کے یہ تمام ایسے عالمی سطح پر کافی شدت سے سامنے آئے جس سے برصغیر کا معاشرہ متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکا۔ناول گریز کا نعیم خارجی سطح پر تو زندگی کے حقائق سے فرار چاہتا ہے مگر اندرونی کش مکش کے سامنے بے بس دکھائی دیتا ہے۔چونکہ بیسویں صدی میں فرائڈ کے نظریہ تحلیل نفسی اور شعوری ولاشعوری محرکات کے نتیجے میں فرد کی عمومی نفسیات کا مطالعہ کیا گیا لہٰذا اس دور کی مناسبت سے اگر دیکھا جائے تو جدید علوم وفنون ،رجحانات ومیلانات اور افکار و نظریات نے شعوری یا غیر شعوری طور پر ہندوستانی ادیبوں اور فن کاروں کو بھی متاثر کیا۔سیاسی ،تاریخی اور تہذیبی عوامل و عواقب کے نتیجے اور رد عمل میں مشرقی روایات سے انحراف وبغاوت جدید اور ذہین انسانوں کا مقدر بن گیا۔سائنس اور ٹیکنالوجی کی ترقی نے قطعیت اور آگہی میں اضافہ کر دیا۔نعیم کے کردار کی قطعیت اور آگہی بلا وجہ نہیں۔ گریز میں عزیز احمد نے واحد متکلم کا صیغہ اپنا کر نعیم کی خوداعتمادی، یقین اور اس کے نقطہ نظر کو زیادہ موثر انداز میں پیش کیا ہے اور جگہ جگہ ڈرامائیت کا بھی احساس ہوتا ہے۔نعیم جن داخلی کیفیات ، ذہنی انتشار اور نفسیاتی الجھنوں کے علاوہ جن خارجی حالات اور عوامل سے گزرتا ہے اس کی آئینہ سامانی بڑے ہی فنکارانہ طور پر کی گئی ہے [11] گریز میں فرد کی داخلی دنیا کے علاوہ زندگی کے ٹھوس حقائق مثلاً بے باک نظریہ سازی، جنسی بیداری، شہری زندگی کی الجھنیں، مشرق و مغرب کی آمیزش سے جنم لینے والا سماج، معاشرتی ناہمواریوں سے

پیدا ہونے والے جذباتی رویے، سیاسی بحران سے وابستہ کرب انگیز صورت حال، محنت کش اور مزدور طبقے کی محرومیاں، مذہب اور کفر والحاد کی رزم آرائی، یقین اور اعتماد کے پہلو بہ پہلو بے سمتی کا احساس، رومانوی سطح پر محبت کے روایتی اور راست طریقے سے روگردانی، ذاتی انا کے زعم میں خود فریبی میں مبتلا ہونا اور روزمرہ کی بنیاد پر فرد کے متزلزل ارادوں سے تشکیل ہوتی ہوئی دنیا کو پیش کیا گیا ہے۔ اس تمام منظر نامے سے بہ خوبی اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ گریز کا فرد اپنے عہد کے رجحانات اور میلانات سے متاثر ہو کر مسائل کی گھمبیرتا اور حالات کے بھنور میں کس طرح ایک نئے فلسفہ حیات کی تلاش میں سرگرداں ہے۔ زندگی کی سچائیوں سے بسا اوقات آنکھیں نہ ملانا اور آئیڈیلزم کی سطحیت کا شکار ہونا گریز کے فرد کا اساسی المیہ ہے۔ اس حوالے سے یہ رائے کافی اہمیت کی حامل ہے کہ:

> "اس ناول کا مرکزی کردار نعیم اپنے عہد کے اہم رجحانات اور میلانات کا نمائندہ ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ عزیز احمد نے جس دور میں آنکھیں کھولیں مذہبی، اخلاقی اور تہذیبی قدریں بتدریج فنا ہوتی جا رہی تھیں۔ نت نئی تبدیلیوں تحریکوں اور رجحانوں نے انسانی ذہن و دماغ کو حقیقت پسندی سے قریب کر دیا تھا۔ سائنس اور جدید نفسیاتی علوم نے جنس کی اہمیت اور ماہیت کی وضاحت کر دی تھی۔ جنسی نظریات اور کیفیات کا اظہار عالمی ادب میں معیوب نہیں تھا۔ بلکہ اس سے دلچسپی اتنی بڑھی کہ اس کے مختلف پہلوؤں پر تحقیق اور تجربے کئے جانے لگے۔ زندگی کی سچائیوں کو حقیقت پسندانہ طور پر پیش کیا جانا اس دور کے ناول نگاروں کی اہم ترین خصوصیت ہے۔ یہ نہیں کہ زندگی کی ٹھوس حقیقتوں سے اغماض کیا جائے۔"(12)

کرشن چندر نے یوں تو کئی ناول لکھے مگر ناول شکست ان کی بنیادی پہچان ہے۔ یہ کرشن چندر کا پہلا ناول ہے جو 1943ء میں منظر عام پر آیا۔ یہ حقیقت ہے کہ کرشن چندر اپنے منفرد اسلوب، ناولوں کی فضا بندی اور پر کشش کردار نگاری میں اپنا ثانی نہیں رکھتے۔ اسی لیے "شکست" میں بھی یہ فنی و فکری تاثر قائم ہے۔ اس ناول کا بنیادی موضوع بااثر طبقے کا اثر ورسوخ اور زیر دست طبقے کی مجبوریاں اور محرومیاں ہیں۔ کرشن چندر نے اس ناول کے سماجی و معاشرتی مسائل کو رومان پرور مضامین میں پیش کر کے حقیقت پسند موقف کو اختیار کیا ہے۔

مذکورہ ناول میں سماجی رکاوٹیں دو محبت کرنے والوں کو یکجا ہونے نہیں دیتیں۔ اگرچہ ناول موضوع کی مناسبت سے ہمہ گیر نہیں مگر ناول نگار سماج میں موجود بااثر ناسوروں کی ذہنی غلاظت کو سامنے لانے میں کافی حد تک کامیاب ہے

۔''شکست'' بنیادی طور پر موہن سنگھ اور اچھوت لڑکی چندرا کے ساتھ شیام اور ونتی کی محبت پر مبنی ہے۔مذہبی اجارہ دار، سماجی اور خاندانی حیثیتوں کو منفی سطح پر استعمال کرنے والے کردار اپنے فرسودہ طور طریقوں سے ذات پات اور طبقاتی اونچ نیچ سے ان کی راہ میں دیوار کھڑی کر دیتے ہیں۔اس کے باوجود یہ محبت کرنے والے ان اصولوں سے انحراف کرتے نظر آتے ہیں۔اس انحراف کی بہترین مثال اچھوت لڑکی چندرا ہے۔جب کہ شیام باشعور اور تعلیم یافتہ تو ہے مگر تہذیب و تمدن کی کہنہ روایات سے چھٹکارا حاصل کرنے کی خواہش کے باوجود کوئی عملی اقدام اٹھانے سے عاری ہے۔اس ناول میں فرد کی داخلی کشمکش اور پیچ وتاب کو سماجی اقدار سے باہم متصادم ہوتے دکھایا گیا ہے۔ڈاکٹر منتظر مہدی شکست کے متعلق اپنی رائے کا اظہار یوں کرتے ہیں :

> ''شکست دراصل محبت اور رومان کے پس منظر میں دو قدروں اور دو قوتوں کا تصادم ہے۔ایک طرف وہ قوتیں ہیں جو فرسودہ نظام کو بنائے رکھنا چاہتی ہے اور جو مذہب، ذات پات، چھوا چھوت، اونچ نیچ اور معاشی واقتصادی تفریق پر منحصر رجعت پسند قدروں کی آڑ میں معاشی و طبقاتی استحصال اور ظلم واستبداد کو روا رکھنا چاہتی ہیں۔دوسری طرف وہ قوتیں ہیں جو اس فرسودہ نظام سے بغاوت کرنا چاہتی ہے۔مذہب، ذات پات، چھوا چھوت، اونچ نیچ اور امیر غریب کی تفریق سے بالاتر ہو کر محبت اور انسان دوستی کی حمایت کرنا سماج کو ظلم و استبداد اور استحصالی شکنجوں سے آزاد کرانا چاہتی ہے''(13)

1941ء میں ضدی کے عنوان سے ناول لکھ کر عصمت چغتائی نے ناول نگاری کا آغاز کیا۔دیگر ناول نگاروں کی طرح عصمت کے ہاں بھی ناول کافی زیادہ ہیں مگر ناول ٹیڑھی لکیر ان کا نمائندہ ہے۔اس ناول میں مصنفہ نے مرکزی کردار شمن کی لاشعوری محرومیوں کے نتیجے میں تشکیل پانے والی بیمار ذہنیت کو مخصوص معاشرتی ماحول میں اجاگر کیا ہے۔کردار نگاری کے لحاظ سے یہ ناول مرکزی کردار کے ارتقائی مراحل پیش کرنے میں کافی اہم ثابت ہوتا ہے۔شمن ایک ایسے گھرانے میں جنم لیتی ہے جہاں کثرتِ اولاد کے سبب وہ عدم توجہ کا شکار رہتی ہے۔یوں بچپن سے سن بلوغ اور بلوغت سے پختہ عمر کی دہلیز پر قدم رکھتے رکھتے یہ کردار اپنی محرومیوں، نفسیاتی خواہشات اور شخصیت کی عدم تکمیل کا مداوا زندگی کی داخلیت پسند کیفیات میں ڈھونڈتا ہے۔اس کردار کی کجی میں اس کے گھرانے سے لے کر ارد گرد ماحول اور معاشرے کا بڑا عمل دخل ہے اسی لیے شمن ہمیشہ ٹیڑھی لکیر ہی کا انتخاب کرتی ہے۔ہم جنسیت جیسی بیماری میں مبتلا ہونا، ادھیڑ شخص کی محبت میں گرفتار

ہونااور بعد میں فطری طور پر صحت مند ازدواجی زندگی کے انتخاب میں مناسب شریک حیات کاانتخاب نہ کرنا شمن کے کردار کو سمجھنے میں کافی معاون ثابت ہوتے ہیں۔ نیلم فرزانہ کردار شمن کے متعلق لکھتی ہیں :

> ''شمن کی نفسیات کے ٹیڑھے پن کا خلاصہ اس قدر ہے کہ وہ محبت کی بھوکی لڑکی ہے۔ پیدا ہوتے ہی ماں کی محبت سے محروم ہو گئی۔ وہیں سے وہ محبت کی تلاش شروع کرتی ہے۔ لیکن ہر تجربہ اسے دھوکا دیتا ہے اور یہ دھوکے بھی لمحاتی ہوتے ہیں جو اس کی تشنگی میں اور اضافہ کرتے ہیں۔ وہ جس مخصوص معاشرے میں پرورش پاتی ہے۔اس کے مریضانہ جراثیم اس میں سرایت کرتے چلے جاتے ہیں۔ یہ تمام عناصر مل کر اس کی نفسیات میں کمی پیدا کر دیتے ہیں۔اس کے مزاج میں ضد اور بغاوت پیدا ہو جاتی ہے۔ ذہن پر اس کی حکمرانی نہیں ہوتی بلکہ وہ ہمیشہ اپنے لاشعور کا کہا مانتی ہے۔ بعد میں وہ شرمندہ بھی ہوتی ہے چند لمحے سوچتی ہے اور پھر اس کا باغی ذہن اپنی راہ پر دوبارہ بھاگ نکلتا ہے۔''(14)

ڈپٹی نذیر احمد سے لے کر عصمت چغتائی تک اردو ناول فکری تنوع اور فنی شعور سے ہم آہنگ ہو چکا تھا۔اس کا یہ ارتقائی سفر اپنے موضوع اور کرداری خصوصیات کی بنا پر انسانی زندگی کے پہلو بہ پہلو رہا ہے۔اس لیے فرد پر ثقافتی، تہذیبی، تمدنی، مذہبی، معاشرتی اور اقتصادی اثرات کا بیانیہ ناول جیسی صنف میں بخوبی سمویا گیا ہے۔ کسی دور کے ذاتی و اجتماعی حالات کو افسانوی ادب میں محسوس کرنا اور اسے عوام تک لانا مشکل کام ہے کیوں کہ اس صنف میں ادیب بہ یک وقت دو زندگیوں کا اسیر بن کر رہ جاتا ہے۔ مصنف اپنے ذاتی خول سے نکل کر اپنے کرداروں کی ذہنی تشکیل کے لیے خود کو قربان کر دیتا ہے تاکہ اپنے عہد کے فرد کی زندگی کو حیات و کائنات کے سربستہ رازوں کے ساتھ پیش کر سکے۔ مراۃ العروس کی تخلیق سے لے کر ٹیڑھی لکیر تک اردو ناول نگاری کے ہاں فرد کے متنوع رنگ اور شخصیت کی لاتعداد جہتیں سامنے آتی ہیں۔ 1857ء کے زمانے میں تہذیبوں کا تصادم اور عدم شناخت کا خوف سماج اور معاشرے کے معروضی کینوس کا احاطہ کرتا ہے۔ایسے میں فرد کے ذہن میں اٹھنے والے سوالات کو نہ صرف ناولاتی سطح پر برتا گیا بلکہ اس کے منفی و مثبت اثرات کی مختلف صورتیں بھی واضح کی گئیں۔ برصغیر پاک و ہند میں ہزار سالہ مغلیہ عہد کے بعد محکومی اور غلامی کے جس ذلت آمیز تصور نے جنم لیا اسے انگریزی نوآبادیاتی نظام کے ساتھ مقامی سطح پر جاگیر دارانہ نظام نے بھی بڑھاوا دیا۔یوں سیاسی اور اقتصادی اعتبار سے مشترکہ برصغیر کے عام فرد کی زندگی کے مسائل اجاگر کرنے کی پوری کوشش اردو ناولوں میں نظر آتی ہے۔ غربت، افلاس، بھوک

اور بااثر طبقے کے ظلم و ستم سے لے کر مذہبی اجارہ داری جیسے منفی اقدامات کی بازگشت اردو ناولوں میں سنائی دیتی ہے۔اس کے علاوہ صدیوں پرانی تہذیب کی شکست وریخت معاشرے میں اخلاقی معیار کے زوال کا سبب بن کر ظاہر ہوتی ہے۔اس پورے تغیراتی عمل میں فرد حال کی نفی کر کے ماضی میں پناہ لینے کی کوشش کرتا ہے مگر تاریخی اور سماجی جبر اسے جدید اور نئی تہذیب کے ایندھن میں جھونک دیتے ہیں۔لہذا سرمایہ داریت کے استحکام اور طبقاتی کشمکش کے بعد سیاسی ہلچل اور سماجی بیداری سے فرد کا واسطہ پڑتا ہے۔وہ سوشلسٹ اور کمیونسٹ نظریات کے سہارے زندگی پر قابو پانا چاہتا ہے۔مگر اس کے باوجود وہ داخلی سطح پر تنہائی محسوس کرتا ہے۔خارجی حقائق کے علاوہ وہ اپنی جسمانی آسودگی بھی چاہتا ہے مگر اس کے باوجود لاشعور میں اتنی محرومیاں ہیں جو اسے مزید ناآسودہ کر دیتی ہیں۔اس لیے ہمارے بیشتر ناول نگاروں کے ہاں کرداری تضادات اور شخصیت کی متلون مزاجی کافی نمایاں ہے۔فرد کی ذہنیت کے اس اضطراب زدہ پہلو کو نمایاں کرنے میں بیسویں صدی کا شعور بھی کافی کارآمد رہا ہے۔اس صدی کے ساتھ حقیقت نگاری اور منطق کا غالب رجحان پروان چڑھنے لگا جس سے فرد کے ہاں نفسیاتی عوامل، پیچیدگیاں اور جنسی مسائل کو عالمی سطح پر محسوس کیا گیا۔یوں فرد کے مسائل کو عمومی زاویے سے سمجھنے کی کوشش کی گئی اور اسے ادب میں ناول جیسی صنف نے قدرے تفصیل سے پیش کیا تا کہ ادبی فریضے کے ساتھ ساتھ انسانی زندگی میں پیش آنے والی تبدیلیوں کا احاطہ کیا جا سکے۔

حوالہ جات

۱۔ انیس ناگی، نذیر احمد کی ناول نگاری، نئی مطبوعات، لاہور، 1966ء، ص5

۲۔ یوسف سرمست، پروفیسر، بیسویں صدی میں اُردو ناول، بک ٹاک، لاہور، 2019ء، ص153

۳۔ سہیل بخاری، ناول نگاری، مکتبہ میری لائبریری، لاہور، 1966ء، ص188، 189

۴۔ یوسف سرمست، پروفیسر، بیسویں صدی میں اُردو ناول، بک ٹاک، لاہور، 2019ء، ص191

۵۔ سہیل بخاری، ناول نگاری، مکتبہ میری لائبریری، لاہور، 1966ء، ص130، 131

۶۔ علی احمد فاطمی، پروفیسر، تاریخی ناول: فنی اور اصول مشمولہ: سہ ماہی ادبیات خصوصی نمبر: اُردو ناول ڈیڑھ صدی کا قصہ (جلد اول)، اکادمی ادبیات پاکستان، 2019ء، ص38

۷ یوسف سرمست، پروفیسر، بیسویں صدی میں اُردو ناول، بک ٹاک، لاہور، 2019ء، ص103

۸۔ ایضاً

۹۔ امان اللہ محسن ، نیا ناول : نئے تجربات، مشمولہ : سہ ماہی ادبیات خصوصی نمبر : اُردو ناول ڈیڑھ صدی کا قصہ (جلد اول) اکادمی ادبیات پاکستان، 2019ء، ص119

۱۰۔ یوسف سرمست، پروفیسر، بیسویں صدی میں اُردو ناول، بک ٹاک، لاہور، 2019ء، ص95

۱۱۔ اسلم آزاد، ڈاکٹر، فقیر حسن، ڈاکٹر، اُردو ناول کا ارتقاء، بک ٹاک، لاہور، 2020ء، ص52

۱۲۔ ایضاً ص ص51، 52

۱۳۔ منظر مہدی، ڈاکٹر، ترقی پسند اردو ناول، بک ٹاک، لاہور، 2019ء، ص147

۱۴۔ نیلم فرزانہ، اُردو ادب کی خواتین ناول نگار، فکشن ہاؤس، 2017ء، ص94